ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

مریم نشاط کندی ۞

اردو میں سفرناموں کی روایت اور رضا علی عابدی کے سفرناموں میں تاریخی شعور

Tradition of travelogues in Urdu and historic consciousness in the travelogues of Raza Ali Abidi

By *Marium Nishat Kundi, MPhil scholar, Department of Urdu and Oriental Languages, Sargodha University, Sargodha.*

ABSTRACT

The tradition of Travelogue in creative prose has introduced a new flavor to Urdu Literature. The growing popularity of travelogues in non-fiction prose cannot be denied. There is a strong tradition of travelogue in urdu literature with the help of which the civilization, culture and history of different countries and regions can be understood from new angles. Raza Ali Abidi is famous among those writers who has worked in different domains of literature. He is constantly writing in fiction and non-fiction. In addition to this, he also produced Children's literature. Besides this, he continued to work in the field of column writing. In November 2013, he was awarded an honorary doctorate degree by The Islamia University of Bahawalpur for his services in the field of broadcasting, journalism and arts. The reason behind his popularity in literature also depends on travelogues. Raza Ali Abidi is a travel writer whose travelogues offer a glimpse of civilization, culture and history. The main feature of his travelogues is the retrieval of historical consciousness. His style and historical consciousness makes his travelogues unique. This article discusses the tradition of Urdu travelogues and the speciality of Raza Ali Abidi in it.

Keywords: Travelogues, Sense of history, Historical consciousness, Indo-Pak civilization.

۞ ایم فل اسکالر، شعبۂ اردو اور مشرقی زبانیں، سرگودھا یونی ورسٹی، سرگودھا

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

اصنافِ ادب میں سفرنامہ قدیم اور مقبول صنف ہے۔ سفرنامہ صرف معلومات کا انبار لگا دینے یا مصنف کے ذاتی مشاہدات و تاثرات کا نام نہیں بلکہ ادبی نقطہ نظر سے بہترین سفرنامہ وہ ہے، جس میں سفرنامہ نگار اپنے مشاہدات وتجربات کے ساتھ ساتھ ہر علاقے کی تہذیبی، ثقافتی، مذہبی، معاشی، علمی وادبی، سیاسی وسماجی اور تاریخی حالات کو مکمل جزئیات اور غیر جانبداری کے ساتھ سمیٹتا چلا جائے۔ بعض اوقات سفرنامہ نگار تخیل سے بھی کام لیتے ہیں اور کہیں کہیں تاریخ کے اوراق کے ذریعے سے بھی حقیقت تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ انیسویں صدی میں یوسف خان کمبل پوش کے عجائباتِ فرہنگ (۱۸۴۷ء) سے لے کر اب تک بے شمار سفرنامے لکھے گئے۔

اردو ادب میں سفرناموں کی طویل روایت موجود ہے۔ ان میں مولانا شبلی نعمانی کا ''سفرنامۂ روم ومصر و شام'' (۱۸۹۴ء)، منشی محبوب عالم کا ''سفرنامۂ یورپ'' (۱۹۰۸ء)، ''سفرنامۂ بغداد'' (۱۹۲۱ء)، خواجہ غلام الثقلین کا سفرنامہ ''روزنامچۂ سیاحت'' (۱۹۱۲ء)، شیخ عبدالقادر کا ''مقامِ خلافت'' اور ''سیاحت نامۂ یورپ''، خواجہ حسن نظامی کا سفرنامہ ''سفرِ مصر، فلسطین و شام'' (۱۹۱۱ء)، سیّد سلیمان ندوی کا سفرنامہ ''سیرِ افغانستان'' (۱۹۴۷ء)، قاضی عبدالغفار کا ''نقشِ فرنگ'' (۱۹۲۴ء)، عبدالماجد دریا بادی کا ''سفرِ حجاز'' (۱۹۳۱ء)، مولانا غلام رسول مہر کا ''سفرنامۂ حجاز'' (۱۹۳۰ء)، ممتاز مفتی کا ''ہند یاترا''، ''لبیک''، محمود نظامی کا ''نظرنامہ'' (۱۹۵۸ء) اہم ہیں۔ ان کے علاوہ آغا محمد اشرف کے دو سفرنامے ''لندن سے آدابِ عرض''، ''دیس سے باہر''، خواجہ احمد عباس کا سفرنامہ ''مسافر کی ڈائری''، قیوم نظر کا سفرنامہ ''پیرس سے روم تک''، میرزا ادیب کا ''ہمالہ کے اُس پار''، رحمٰن مذنب کا ''سنہری پہاڑوں کی وادی''، حکیم محمد سعید کے سفرنامے ''یورپ نامہ''، ''جرمنی نامہ''، ''ماہ وروز''، ''چار ملک ایک کہانی''، ڈاکٹر عبادت بریلوی کا ''سفرنامۂ ارضِ پاک سے دیارِ فرنگ تک''، شفیق الرحمٰن کا ''دجلہ''، غلام الثقلین نقوی کا ''ارضِ تمنا''، ابراہیم جلیس کا سفرنامہ ''نئی دیوارِ چین'' وغیرہ بھی سفرناموں کی روایت میں اہم اضافہ ہیں۔ بیسویں صدی کے وسط اور آخری عشروں میں بھی بہت سے سفرنامہ نگار منظرِ عام پر آئے جن کے سفرنامے معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ زبان وادب میں اضافے کا باعث بنے۔ ان میں محمد خالد اختر، اے حمید، اشفاق احمد، انتظار حسین، جمیل الدین عالی، ابنِ انشا، قرۃ العین حیدر، بیگم اختر ریاض الدین، محمد اختر ممونکا، ابوسعید قریشی، جمیل یوسف، افضل علوی، ابوسعید قریشی، قمر عباسی، محمد طفیل، جاوید دانش، اسلم کمال، نظیر صدیقی، صالحہ عابد حسین، رضا علی عابدی، فاروق خالد، رفیق ڈوگر، مستنصر حسین تارڑ، عطاء الحق قاسمی وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے سفرناموں نے بھی بہت مقبولیت حاصل کی۔ سفرنامہ نگاری کا یہ سلسلہ جاری ہے۔

ان سفرناموں میں اندرونِ ملک اور بیرون ممالک کے اسفار شامل ہیں۔ لکھنے والوں نے اپنے ذاتی

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

مشاہدات و تاثرات کے ساتھ ساتھ دورانِ سفر پیش آنے والے تجربات کو بھی قلم بند کیا ہے۔ سفرناموں میں جہاں مختلف علاقوں کی تہذیب وثقافت، خوب صورت مقامات، علوم وفنون، مذہب وعقائد کی پیش کش ہوتی ہے، وہیں تاریخی پہلو کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاتا۔ اوپر بیان کیے گئے سفرناموں کی فہرست میں کچھ ایسے سفرنامے بھی ہیں جہاں تاریخ کے پہلو کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ جیسے منشی محبوب عالم نے اپنے سفرنامے ''سفرنامۂ بغداد'' (۱۹۲۱ء) میں عرب وعراق کی جغرافیائی زندگی کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخی حالات کو بھی نمایاں اہمیت دی ہے۔ سیّد سلیمان ندوی نے ''سیرِ افغانستان'' (۱۹۴۷ء) میں افغانستان کی سیاسی ومعاشرتی حالت اور تاریخی آثار کو بڑی چابک دستی سے سفرنامے میں بیان کیا ہے۔ ان کے اس سفرنامے کے بارے میں مولانا عبدالقدوس ہاشمی رائے دیتے ہیں کہ "اس سفرنامے میں سوانح بھی ہیں اور تذکرے بھی ہیں، احوال بھی ہیں اور افکار بھی ہیں، تاریخی اسناد بھی ہیں اور جغرافیائی معلومات بھی۔"[1] اسی طرح محمود نظامی کے ''نظرنامہ''(۱۹۵۸ء)، حافظ لدھیانوی کے ''جمالِ حرمین'' (۱۹۷۴ء) اور شفیق الرحمٰن کے سفرنامہ ''دجلہ'' (۱۹۸۰ء) میں بھی تاریخی حوالے نظر آتے ہیں۔ تاریخ گزرے ہوئے زمانوں کو زندہ کرتی ہے۔ تاریکی میں سوئی ہوئی داستانوں کو چپکے سے بیدار کرتی ہے۔ اُن ناموں اور کرداروں پہ پڑی وقت کی گرد کو جھاڑ کے پھر سے صاف کرتی ہے جن کا ماضی میں کوئی خاص کردار تھا۔ سفرنامہ نگاری میں اس خاص تاریخی پہلو کو اہمیت دینے میں ایک اہم نام رضا علی عابدی کا ہے۔

رضا علی عابدی (۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء) کو بطور براڈ کاسٹر کی حیثیت سے جتنی شہرت ملی ایسی ہی مقبولیت و پذیرائی انھیں سفرنامہ نگاری میں بھی حاصل ہوئی۔ ان کے سفرنامے جن اسفار پر مشتمل ہیں، وہ عالمی نشریاتی ادارہ بی بی سی کے پروگراموں کے لیے کیے گئے۔ ان میں ''جرنیلی سڑک'' (۱۹۸۹ء)، ''شیر دریا'' (۱۹۹۶ء)، ''ریل کہانی'' (۱۹۹۷ء) وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں ایک مختصر سفرنامہ ''جہازی بھائی''(۱۹۹۶ء) بی بی سی کے پروگرام کے لیے نہیں تھا۔ رضا علی عابدی اپنے سفرناموں میں جہاں تہذیب وثقافت کے رنگ دکھاتے نظر آتے ہیں وہیں ایک مؤرّخ کا کردار بھی نبھاتے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں کہ "ماضی کی بازیافت کے لیے ادبی مؤرّخ کا متخیّلہ نہایت تیز ہونا چاہیے۔ اس کا متخیّلہ بے جان ماضی میں روح ڈال دیتا ہے۔ ساکن زمانوں کو متحرّک کر دیتا ہے اور سوئی ہوئی مجلسوں میں روح ڈال دیتا ہے۔"[2] عابدی صاحب سفرناموں میں ایک ایسے ہی مؤرّخ کا کردار بھی ادا کرتے ہیں جن کا متخیّلہ تیز ہے۔ ان کے ہاں تاریخی شعور کی پختگی نظر آتی ہے۔ علاقوں کی تاریخ پیش کرتے وقت شگفتہ اور رواں اسلوب اپناتے ہیں تاکہ پڑھنے والا کہیں اکتاہٹ کا شکار نہ ہو۔

رضا علی عابدی کا سفرنامہ ''جرنیلی سڑک'' اپنی نوعیت کا ایک بہترین شاہ کار ہے۔ یہ سفرنامہ ۱۹۸۹ء میں

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور سے شائع ہوا۔ اس سفر کے حوالے سے عابدی صاحب کہتے ہیں کہ "ایک روز ڈیوڈ پیج نے مجھ سے پوچھا رضا! تمھیں شیر شاہ سوری یاد ہے؟ میں نے کہا، "ہاں" اس نے پوچھا کیوں؟ میں نے کہا، "اس نے پشاور سے کلکتہ تک ایک سڑک بنوائی تھی، جرنیلی سڑک۔" بس اس طرح اپنی تعمیر کے پونے پانچ سو سال بعد اس تاریخی شاہراہ کا ذکر اس شان سے چھڑا کہ ایک عالمی نشریاتی ادارے نے فیصلہ کیا کہ اس عظیم سڑک کے موضوع پر ایک دستاویزی پروگرام تیار کر کے نشر کیا جائے۔ اس شام میں لپک کر گھر آیا۔ اپنے کتب خانے سے رام آشرے شرما کی کتاب 'شیر شاہ' اور اس کا عہد نکالی اور سات سو صفحوں کی کتاب تین دن میں پڑھ ڈالی۔"(۳)

اس سفرنامے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مصنف نے ہمیں ہندو پاک کی سیر کروانے کے ساتھ ساتھ شہروں کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، علمی و ادبی، مذہبی، جغرافیائی صورتِ حال کو بیان کیا، وہیں تاریخی واقعات، شہروں کی تاریخ کو بھی بھرپور انداز میں بیان کیا ہے۔ شیر شاہ سوری نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا تو اس نے تعمیراتی کاموں پر بھرپور توجہ دی۔ اس حوالے سے مولوی ذکاء اللہ نے اپنی کتاب ''تاریخِ ہندوستان'' میں لکھا ہے کہ ''جو ملک شیر شاہ کے تصرف میں آتا تھا، اُس کی عمارت و زراعت میں وسعت کرتا تھا۔ اور تھوڑے دنوں میں اپنی حالت سابقہ سے بہتر ہو جاتا تھا۔"(۴) شیر شاہ سوری اپنے اختیارات کو ذاتی مفاد کی بجائے رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرتا تھا۔ شیر شاہ ایک تعمیری ذہن کا مالک تھا۔ اُس نے سڑکیں تعمیر کروانے میں اپنا جداگانہ اسلوب قائم کیا تھا۔ ساڑھے چار سو سال پہلے شیر شاہ سوری نے ایک عظیم شاہراہ— پشاور سے کلکتہ تک— جرنیلی سڑک جسے گرینڈ ٹرنک روڈ (G. T. Road) بھی کہا جاتا ہے، تعمیر کروائی اس کی لمبائی پندرہ سو کوس تھی۔ اس سڑک کو پاکستان میں جرنیلی سڑک کہا جاتا ہے، جب کہ ہندوستان میں اس شاہراہ کو شیر شاہ سوری مارگ کہا جاتا ہے۔ لفظ "مارگ" سنسکرت میں سڑک کو کہتے ہیں۔ صفدر حیات صفدر اپنی کتاب ''عہدِ مغلیہ مع دستاویزات'' میں لکھتا ہے کہ "شیر شاہ سوری ایک عظیم انجینئر تھا۔ اس نے چار بڑی سڑکیں بنوائیں۔ پہلی سڑک بنگال کے سنار گاؤں سے دریائے سندھ تک بنائی گئی۔ اس سڑک کو عظیم سڑک کہا جاتا تھا اور اس کی لمبائی پندرہ سو کوس تھی۔ اسے شاہراہِ اعظم یا گرینڈ ٹرنک روڈ کہا جاتا تھا۔ دوسری سڑک آگرہ سے برہان پور جاتی تھی۔ تیسری سڑک آگرہ سے جودھ پور اور چتوڑ پہنچتی تھی۔ چوتھی سڑک لاہور سے ملتان جاتی تھی۔"(۵) شیر شاہ کی اسی عظیم شاہراہ گرینڈ ٹرنک روڈ کو موضوع بنا کر سفرنامہ ''جرنیلی سڑک'' لکھا گیا۔ اس سفرنامے میں ہر موڑ پر تاریخ کے دروازے کھلتے نظر آتے ہیں۔ جن میں رضا علی عابدی قاری کا ہاتھ تھامے داخل ہوتا ہے اور تاریخ کی وادیوں میں جا نکلتا ہے۔ اپنے اس سفرنامے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس پر کبھی کبھی تاریخ کی داستان کا گماں بھی ہوتا ہے۔ اور یہ بات درست ہے کہ ان کے سفرنامے

تاریخ کی داستان معلوم ہوتے ہیں۔ دیگر سفرنامہ نگاروں کے برعکس عابدی صاحب اپنے عمیق مشاہدے سے اُن تاریخی گوشوں کو بھی سامنے لاتے ہیں جن پر عموماً مورخین ہی نگاہ ڈالتے ہیں۔

جرنیلی سڑک کی تعمیر کب اور کیوں ہوئی؟ اس کا مقصد کیا تھا؟ یہ سب اس سفرنامے کو پڑھ کے معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کہ شیرشاہ خود پٹھان تھے۔ اُس کے ساتھ وہی پٹھان سپاہی تھے جو اُس کے اپنے علاقے سے ہی آتے تھے۔ اِس سڑک کو تعمیر کرنا اُن کے دفاع کے لیے ضروری تھا، تاکہ عسکری قوت میں اضافے کے لیے پٹھان سپاہیوں کے علاوہ مختلف علاقوں سے نیازیوں، لودھیوں، سوریوں اور شیرانیوں کو بھرتی کر کے لے جایا جا سکے۔ اس کے ساتھ ایک مقصد تجارت بھی تھا۔ عابدی صاحب یہ بھی دکھاتے ہیں کہ اس وقت مسافروں کی سہولت کے لیے سڑک کے کنارے ۱۷۰۰ سرائیں بھی تعمیر کروائیں گئیں۔ ایک کوس کے فاصلے پر ایک سرائے ہوتی تھی۔ یہ انتظام صرف جی ٹی روڈ کے کنارے ہی نہیں تھا بلکہ دیگر ملتان، چتوڑ، اور خاندیش جانے والی سڑکوں کے گرد بھی ایسی ہی سرائیں بنوائی گئیں۔ سرائے دو طرح سے کام آتی تھیں۔ ایک تو ٹھہرنے کے لیے دوسرا کاروباری لین دین کے لیے، اُس وقت کی سرائے میں بڑے بڑے سودے طے ہوتے تھے۔ جرنیلی سڑک کی تعمیر سے عام لوگوں، تاجر اور فوج سب کو فائدہ ہوا۔ مصنف شیرشاہ کے انتظامی امور کو سراہتے بھی نظر آتے ہیں کہ سڑک کے گرد بسنے والوں کو شیرشاہ نے جاگیریں دیں تاکہ لوگ پیسا کمائیں اور سڑک کی دیکھ بھال کریں۔ ایک خاص پہلو عابدی صاحب کے ہاں موجود ہے کہ وہ شہروں کی تاریخ اُن کے بننے اور اُجڑنے کا احوال بہت عمدگی سے بیان کرتے ہیں جیسے پشاور شہر کے بارے بتاتے ہیں کہ یہ پاکستان کا قدیم شہر ہے۔ اس کا یونانی، عربی مورخوں اور چینی سیاحوں نے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔ اس کے عجیب و غریب نام لکھے جیسے پُسکا پورس، پولو شاپولو، پرشاور، وغیرہ۔ اس شہر کی تاریخ کو ڈاکٹر احمد حسن دانی کی زُبانی یوں بھی بیان کرتے ہیں:

> خوش قسمتی سے کشان زمانے کا ہم کو ایک کتبہ ملا ہے جو دوسری صدی عیسوی کا ہے اور جس میں سب سے پہلے پشاور شہر کا نام آتا ہے اُس میں نام آتا ہے: پوش پور۔ کنشک کے زمانے سے لے کر آج تک یہ شہر آباد ہے، قریب قریب دو ہزار سال ہو گئے جس کے معنی یہ ہوئے کہ پشاور شہر پاکستان میں سب سے پُرانا آباد شہر ہے۔(۶)

اسی طرح پشاور میں کنشک آئے، کشان آئے، ساسانی آئے، ہن آئے، ترک اور ہندو آئے، مغل، درانی اور پھر سکھ آئے۔ انگریز آئے اور پھر آخر کار آزادی آئی۔ شہر بنتے اور بگڑتے کیسے ہیں۔ یہ صورتحال عابدی صاحب کے سفرنامے میں بہت سے شہروں کے پس منظر میں دکھائی دیتی ہے۔ شہروں کی تاریخ کے ساتھ مختلف حکمرانوں

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

کے درمیان ہونے والی جنگوں کا احوال بھی بھرپور انداز میں ملتا ہے۔انگریزوں، سکھوں، جاٹوں، گکھڑوں، افغانوں اور مغل بادشاہوں کے درمیان ہونے والی لڑائیوں کو تاریخی کوائف کے ساتھ بیان کر کے اس سفرنامے کو تاریخی دستاویز کی شکل دی ہے۔ان لڑائیوں میں حکمرانوں کی جنگی حکمت عملیوں کو بھی دکھایا ہے جیسے شیر شاہ سوری نے ہمایوں کے برخلاف گکھڑوں کو اپنے ساتھ ملانے کی دعوت دی اور اُنھوں نے اطاعت کرنے سے انکار کیا تو شیر شاہ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور اس نے کہا کہ خدا نے چاہا تو تمھارے سینے میں ایسی میخ ٹھونکوں گا جسے قیامت تک کوئی نکال نہیں پائے گا۔اور یہ میخ قلعہ رہتاس کی شکل میں گکھڑوں کی سرزمین میں تعمیر کی گئی۔ اس قلعے کی تعمیر کے مقصد کو بھی مصنف بیان کرتے ہیں کہ ایک مقصد تو سرکش گکھڑوں کو دبایا جا سکے اور افغانستان کی طرف سے آنے والے حملہ آوروں کو روکا جائے۔اس جگہ کا انتخاب شیر شاہ سوری کی اعلیٰ ذہانت اور تدبر کا ثبوت ہے۔اس کے ساتھ عابدی صاحب یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس قلعے کی تعمیر پر کتنی لاگت آئی، اس کی تعمیر کب اور کیسے ہوئی ان تاریخی حوالوں کو بھی سامنے لائے ہیں۔اسی طرح انگریزوں اور سکھوں کی چیلیانوالہ میں ہونے والی لڑائی کا ذکر بھی کیا ہے جہاں لاشوں پہ لاشیں گریں،اُس روز سکھ بے دریغ قتل ہوئے۔اس طرح کے تاریخی حالات کا بیان مصنف کے تاریخی شعور کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔اس سفرنامے کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس سڑک کے کنارے کتنے برسوں کی تاریخ موجود ہے۔

جیسے مصنف راستے میں آنے والے شہر تھانیسر کا ذکر کرتے ہیں کہ جس کا نام تبدیل کر کے کروکشیتر رکھ دیا گیا۔یہی وہ جگہ ہے جہاں پرتھوی راج نے شہاب الدین غوری کو اور شہاب الدین غوری نے پھر پرتھوی راج کو شکست فاش دی۔ اسی جگہ برہم سر ہے جس میں گناہ دھوئے جاتے ہیں۔ عابدی صاحب اپنے تاریخی متخیلہ سے اہم واقعات کی تاریخی کڑیوں کو بھی سامنے لاتے ہیں جیسے:

> کرنال،کورو کے جرنیل راجا کرن کا تاریخی شہر ہے۔بابر یہیں سے گزر کر پانی پت گیا تھا،اور نادرشاہ نے اسی شہر کی فصیل کے عین باہر محمد شاہ سے جنگ کی تھی۔ دو گھنٹے کی لڑائی میں شہر پناہ کی بنیادوں میں بیس ہزار ہندوستانیوں کے پشتے لگ گئے تھے۔بے پناہ خزانہ نادرشاہ کے ہاتھ لگا تھا اور اگلے روز محمد شاہ نے خود کو بھی نادرشاہ کے حوالے کر دیا تھا۔یہیں سے چل کر نادرشاہ دلّی گیا تھا۔وہی نگر جو سو مرتبہ لوٹا گیا۔(۷)

عابدی کے اس سفرنامے میں جی ٹی روڈ کے کنارے چلتے چلتے گزرے لمحوں کی ایک یلغار آتی ہے اس

شدت سے حملہ آور ہوتی ہے کہ عمارتوں کی در و دیوار کو جیسے گویائی مل گئی ہو اور وہ چیخ چیخ کے اپنی آپ بیتیاں سُنا رہی ہوں۔ مغلوں کی عمارتوں کا ذکر کرتے ہوئے اُن سے جڑے واقعات کو بھی بیان کرتے ہیں منظر نگاری اور واقعات نگاری کے ایسے جوہر دکھاتے ہیں کہ قاری کو اُس عہد کی چلتی پھرتی تصویریں نظر آنے لگتی ہیں۔ مغل عمارتوں میں سے ایک کمرے کا ذکر کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ مغلیہ سلطنت کا آخری سورج یہیں غروب ہوا یعنی بہادر شاہ ظفر کو ہڈسن نے یہیں سے گرفتار کیا۔ اُن کے ولی عہد جواں بخت، ملکہ زینت محل اور دیگر شہزادوں کو بھی ساتھ گرفتار کیا اور تین شہزادوں کو راستے میں قتل کر کے لاشوں کو کابلی دروازے پر لٹکا دیا گیا۔ زینت محل، جواں بخت اور بہادر شاہ ظفر پر مقدمہ چلایا گیا اور پھر انھیں رنگون بھیج دیا گیا تھا۔ اسی طرح ایک عمارت شیر منڈل کا ذکر کرتے ہیں جہاں شہنشاہ ہمایوں نے اوپر کی منزل میں اپنا کتب خانہ بنایا ہوا تھا۔ ہمایوں علم ہئیت کا شوقین تھا ایک دن مشتری اور زہرہ کا قران تھا اسی روز ہمایوں نیچے اُترتے ہوئے زینے سے پھسل کر گرا اور کنپٹی پر زخم آیا جس کی وجہ وہ جاں بر نہ ہو سکا۔ اس طرح کے واقعات کا بیان کسی دوسرے سفر نامہ نگار کے ہاں نظر نہیں آتا۔ عابدی صرف خوب صورت مقامات کی سیر اور منظر نگاری سے کام نہیں لیتے بلکہ تاریخ سے دلچسپی اور اپنے وسیع مطالعے سے ایسے ایسے واقعات بیان کرتے ہیں جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ معلومات سے بھرپور ہوتے ہیں۔ اپنے سفرناموں میں اُن تاریخی کرداروں کو بھی بیان کرتے ہیں جنھوں نے ماضی میں خاص کردار نبھایا جیسے سہسرام کی حاجی بیگم جو عورت ذات ہونے کے باوجود انگریز سامراج کے سامنے ڈٹ گئی۔ یہ بنگش قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں جب غدر برپا ہوا تو انھوں نے کنور سنگھ کے شانہ بشانہ بغاوت کی اور انگریزوں کا مقابلہ کیا۔

رضا علی عابدی اپنے سفرناموں میں تاریخ کی گمشدہ کڑیوں کو سامنے لاتے ہیں۔ ایک انتہائی قابل ذکر پہلو رضا علی عابدی کے ہاں نظر آتا ہے وہ تاریخی عمارات کے بیان میں جزئیات نگاری سے بھی بھرپور کام لیتے ہیں۔ اس سے ہر عہد میں ہونے والے تعمیراتی کاموں اور تعمیر کرنے والوں کے ذوق کا علم ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ پتا چلتا ہے کہ ہر علاقے کے فنِ تعمیرات میں انفرادیت کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ جیسے مغلوں کی عمارتوں اور پٹھان بادشاہوں کی تعمیرات کا موازنہ کریں تو اس میں ایک خاص فرق دیکھائی دیتا ہے۔ پٹھان بادشاہوں کی عمارتوں میں بڑے پتھر کا استعمال زیادہ کیا گیا ہے جس سے ان عمارتوں میں ایک خاص طرح کا رعب و دبدبہ نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس مغلیہ عہد کی عمارتوں میں نفاست، نزاکت، خوب صورتی زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے رضا علی عابدی نے سفرنامے میں مغلوں اور پٹھانوں کی تعمیر کردہ عمارات کا بیان بھی عمدگی سے کیا ہے۔ گنبد، مینار، محرابیں، ستون، دروازے، فصیلیں، طاق، دریچے، بُرج اور ان پر کی جانے والی پچی کاری، نقاشی، منبت کاری، خطاطی وغیرہ سب

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

کا ذکر ملتا ہے۔ پچی کاری کی ایک مثال تاج محل کے حوالے سے دیکھی جا سکتی ہے:

میرے رہنما نے مجھے سنگ مرمر کے ایک ایک پتھر میں تراشی ہوئی وہ بڑی بڑی جالیاں دکھائیں۔دیواروں میں تراش کر اُتارے ہوئے وہ نقش دکھائے جن کا ایک ایک پھول چونسٹھ مختلف پتھروں سے بنایا گیا ہےاور ایک ایک پنکھڑی میں تین تین چار چار رنگین پتھر بٹھائے گئے تھے۔جن پر رکھ کر ٹارچ روشن کی گئی تو دیوار اندر تک منور ہوگئی۔(۸)

اردو ادب کے دیگر سفرنامہ نگاروں کے ہاں منظر کشی تو ہے،معلومات ہیں،تہذیب کی جھلکیاں ہیں، ثقافتی رنگ ہیں،کہیں تاریخ کا گزر بھی ہوتا ہےلیکن جس طرح رضا علی عابدی کے ہاں تاریخی سماجیات کا بیان ہے وہ کم ہی دوسروں کے ہاں ملتا ہے۔خصوصاً سنین کے استعمال سے اپنی تحریروں کو زیادہ مستند بناتے ہیں۔ جیسے تاریخوں کی ایک جھلک الہ آباد کے حوالے سے دیکھئے کہ الہ آباد کی تاریخ ہی عجب ہے،۱۷۳۹ءمیں مرہٹوں نے اس پر قبضہ کیا،۱۷۵۰ءمیں فرخ آباد کے پٹھان لوٹنے آگئے،۱۷۶۴ء میں انگریزوں نے شاہ عالم کو بکسر میں شکست دے کر الہ آباد پر قابض ہوئے،۱۷۶۵ءمیں اسی جگہ لارڈ کلائیو نے شاہ عالم سے ملاقات کی اور پھر ایسا معاہدہ ہوا جس نے پورے ہندوستان کی تاریخ بدل دی۔۱۸۰۱ء میں اودھ کے نواب سعادت علی نے الہ آباد اُٹھا کے انگریزوں کے حوالے کر دیا،۱۸۵۸ء میں پہلی انڈین نیشنل کانگریس اسی الہ آباد میں ہوئی۔ یہ صرف ایک مثال ہے ایسی بے شمار مثالیں اس سفرنامے کے اندر موجود ہیں۔

اپنے تاریخی ورثے کی موجودہ صورتِ حال پر وہ افسردہ بھی دکھائی دیتے ہیں۔ بیشتر قلعے ایسے ہیں جہاں فوج یا قیدی رہتے ہیں اوران کے دروازے عوام پر بند ہیں۔ ہماری تاریخ کے یہ نشان اب صرف پتھر کے ڈھیر ہیں۔اس سفرنامے میں" رہتاس تنہا کھڑا ہے" کہ عنوان سے اس بڑے قلعے کی حالت زار کو یوں بیان کرتے ہیں کہ" یہ قلعہ جرنیلی سڑک سے صرف پانچ کلومیٹر دور ایک بلند ٹیلے پر کھڑا ہے مگر چُپ سادھے۔عظمت رفتہ کے اس شاہکار کو اب کوئی دیکھنے بھی نہیں آتا۔ایک پٹھان بادشاہ نے اس خطہ زمین پر جو فصیلیں اٹھائی تھیں وہ اپنی قدامت کے باعث نہیں بلکہ دوسروں کی بے توجہی کے سبب یوں جھکی جا رہی ہیں کہ اب گریں اور اب گریں۔"(۹)

بستیوں کے مقدر صرف دریاؤں سے نہیں جڑے ہوتے بلکہ سڑکوں سے بھی وابستہ ہوتے ہیں۔اگر سڑکیں بھی راہ بدل لیں تو یہ نشانیاں راہ میں ہی مر جاتی ہیں۔جیسے یہ شاہراہ جب قلعہ رہتاس کے پہلو سے لگی تھی تو رات دن سینکڑوں قافلے گزرتے تھے مگر انگریزوں نے جب سڑک کو یہاں سے ہٹا کر پانچ میل دور دوسری جانب موڑ دیا

ISSN: 2519-6332 (Print),   ISSN: 2708-1915 (Online)

تو اس عظیم سڑک کا رہتاس سے تعلق ختم ہو گیا۔ عابدی صاحب ایک ادبی مؤرّخ کی طرح ہر شے کو معروضی انداز میں بیان کرتے ہیں ان کے تاریخی شعور کو شان الحق حقی یوں سراہتے ہیں:

> آپ کے ساتھ ساتھ جرنیلی سڑک بلکہ تاریخ کے گزشتہ ادوار کی سیر ہو گئی۔ آپ کا گہرا مُشاہدہ موضوع سے گہری دلچسپی، تاریخ سے لگاؤ کے ساتھ ساتھ عصری احوال سے پوری وابستگی، غرض کیا کچھ نہیں۔ یہ بلاشبہ ایک نادر ادبی کارنامہ ہے جس کی ادبی حیثیت دستاویزی حیثیت سے کم نہیں۔[۱۰]

رضا علی عابدی کا یہ سفرنامہ برصغیر کی تاریخ معلوم ہوتا ہے۔ تاریخ جیسے خشک موضوع میں بھی ان کے ہاں ایک تشنگی کا احساس ملتا ہے۔ جرنیلی سڑک کی طرح انھوں نے سفرنامہ جہازی بھائی میں بھی جزیرہ ماریشس کی تاریخ کا بیان نہایت چابکدستی سے کیا ہے۔ سفرنامہ جہازی بھائی ۱۹۹۶ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور سے شائع ہوا۔ یہ مصنف کی ماریشس میں ایک کانفرنس میں شرکت کے دوران پیش آنے والے معاملات اور مختصر سے سفر کی روداد ہے۔ جس میں عابدی صاحب نے ماریشس اور اس کے تمام حالات و واقعات تاریخی و سماجی تناظر کو بیان کرنے کی بھرپور کاوش کی ہے۔ ماریشس ایک نوآبادیاتی (Colonolised) خطہ ہے۔ انھوں نے اس سفرنامے میں اُن تمام تاریخی معاملات کو گرفت میں لیا ہے جن کی بنا پر ماریشس آباد ہوا۔ اور پھر یہاں تیسری دنیا کے لوگوں کو غلامی کے ہتھکنڈوں میں جکڑ کر کس طرح سے مرکز اپنے مفادات کے حصول کی خاطر جی توڑ کوشش کرتا رہا۔ اس میں نوآبادیاتی نظام کی ایک گونج سُنائی دیتی ہے۔ استعماری طاقتوں (Imperial power) نے کس طرح اس خطے میں اپنی نوآبادیاں قائم کیں، یہاں پر کیسا نظام زندگی لاگو کیا، نوآبادکار اور نوآبادیاتی باشندہ کا تعلق کیسا ہوتا ہے، حاکم کے ہاتھوں مظلوم کا استحصال کس طرح ہوتا ہے عابدی صاحب نے یہ سب تاریخی تناظر میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ جیسے ماریشس کو آباد کیسے کیا گیا اس بارے میں بتاتے ہیں کہ ماریشس میں چھٹی صدی کے وسط میں پہلے عرب آئے ۔ پھر واسکوڈی گاما ادھر سے گزرا۔ اس کے بعد پرتگالیوں نے یہاں قبضہ کیا۔ ولندیزی آئے، انھوں نے آتے ہی یہاں کی زمین میں دولت اُگانے کے لیے غلام لانے شروع کیے۔ ملایا، جاوا، مڈغاسکر اور اس سے بڑھ کے ہندوستان سے غلام لائے۔ انھوں نے ہی نساؤ کے شہزادے ماریس کے نام پر جزیرے کا نام ماریشس رکھا۔ فرانس کے حملوں کا ذکر بھی ملتا ہے کیوں کہ نئی زمینوں پہ قبضہ کرنے کی دوڑ میں فرانس والے بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ ۱۷۱۵ء میں فرانس نے اس سرزمین پر ایسے قدم رکھے جو آج تک جمے ہوئے ہیں۔ انگریزوں نے اس جزیرے پر حملہ کیسے کیا، فرانس کو کس طرح شکست دے کر قابض ہوئے، پھر انھوں نے

ماریشس کے حالات سُدھارنے کے لیے کیا کام کیے ان سب باتوں کو عابدی صاحب نے سہل انداز میں بیان کیا ہے۔جیسے سفرنامے میں ماریشس کی تاریخ کے اس منظر کو یوں بیان کیا کہ فرانس والوں کو انگریزوں نے مشرقی ساحل پر الجھا کر ایک روز شمالی ساحل سے حملہ آور ہوئے پھر پانچ دن بعد فرانسیسی گورنر نے ہتھیار ڈال دیئے اور جزیرہ انگریزوں کو سونپ دیا مگر فرانس کی طرف سے کچھ شرائط بھی رکھی گئیں جیسے کہ فرانسیسی طور طریقے رائج رہیں گے۔فرانسیسی باشندوں کی زبان اور ان کا مذہب جوں کا توں رہے گا، نپولین کا ضابطۂ قانون رائج رہے گا اور انگلستان والوں نے پھر اپنا وعدہ نبھایا۔نورین تبسم اس کتاب کے بارے میں اظہار خیال کرتی ہیں کہ:

> رضا علی عابدی کی یہ کتاب نہ صرف جزیرہ ماریشس کے سفر کا احوال پیش کرتی ہے بلکہ صدیوں پُرانی تاریخ کی داستان بھی ہے۔اُن لوگوں کی کہانیوں کو پیش کرتی ہےجنھیں قسمت نے ان جزیروں میں زندہ درگور کر دیا لیکن اُن کے نام آنے والی نسلوں کے لیے کاغذ پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو گئے۔(۱۱)

ان کے ہاں صرف واقعات کا تسلسل نہیں بلکہ مکمل تاریخی اظہار ملتا ہے۔اس کے ساتھ ماریشس میں آنے والی ہولناک بیماریوں اور ان کے نتیجے میں ہونے والے نقصانات کو بھی بیان کرتے ہیں۔جیسے" ۱۸۵۴ء میں ہیضہ کی وبا پھیلی تو ہزاروں کی جان لے کر ٹلی، پھر کبھی طاعون نے سر اُٹھایا، تو کبھی ملیریا نے پورے جزیرے پر کپکپی طاری کی۔۱۸۶۶ء میں ماریشس میں ایسا قیامت کا ملیریا پھیلا کہ دو سال تک یہ حال رہا کہ راہ چلتے لوگ گر کر مر جاتے تھے اُس وقت کہا جاتا تھا کہ شاید خدا سو گیا ہے۔ن دو برسوں کے دوران ۳۲ ہزار آدمی مرے۔"(۱۲) اس کے علاوہ ماریشس میں غلاموں پر ہونے والے ظلم و جبر کو بھی دکھاتے ہیں کہ کیسے کھیتوں میں ان ہندوستانی مزدوروں سے صبح سے شام تک کام کروایا جاتا۔ان کے کھانے میں غذائیت نام کو نہ تھی۔اُن کے کیمپ کسی کال کوٹھری سے کم نہ تھے۔اگر کوئی مزدور بیماری کے سبب کام پر نہ آ سکتا تو ایک دن کی غیر حاضری پر دو دن کے پیسے کاٹے جاتے۔اسی طرح کی تفصیلات عموماً بہت کم سفرناموں میں ملتی ہیں۔لیکن عابدی صاحب نے اس مختصر سے سفرنامے میں بھی تاریخ نگاری کے عمدہ جوہر دکھائے۔یہ تاریخ کی ایسی تصویریں(Images) صفحہ قرطاس پر اُتارتے ہیں کہ قاری کے سامنے اُس کا مکمل عکس نظر آتا ہے۔

دریائے سندھ کی ہمراہی میں کئے گئے اپنے سفر کو انھوں نے شیر دریا کے نام سے لکھا۔یہ سفرنامہ ۱۹۹۶ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور سے شائع ہوا۔دریائے سندھ پاکستان کا سب سے بڑا دریا ہے۔اس دریا کی تہذیب بھی بہت پُرانی ہے سبط حسن اپنی کتاب پاکستان میں تہذیب کا ارتقا میں لکھتے ہیں کہ" وادیٔ سندھ اور اُس

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

کے معاون دریاؤں کی تہذیبوں کا شمار دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں ہوتا ہے۔"(۱۳) دریاے سندھ کو مصنف نے راتوں کی تاریکی میں خاموشی میں دبے پاؤں بہتے دیکھا، چٹانوں سے ٹکراتے، ساحلوں کو رخساروں کی طرح تھپتھپاتے دیکھا۔دریا کس طرح لوگوں کو جینے کی اُمنگ دیتا ہےاور کیسے اس کی بے رحم موجیں راستے میں آنے والی ہر شے کو تہ وبالا کر دیتی ہیں ان سب کو بیان کیا۔لیکن ان کی نگاہیں دریا کے کنارے اُن منظروں کی طرف بھی گئیں جہاں کتنی ہی ایسی نشانیاں بکھری ہوئی تھیں جو گزرتے قافلوں کی داستانیں سُنا رہی تھیں۔اس سفرنامے میں عابدی صاحب لکھتے ہیں کہ ویسے تو دریائے سندھ خاموشی سے بہہ رہا ہے لیکن اگر اس کو زُبان مل جائے تو یہ رات دن تاریخ کی داستانیں سُناتا اور بتاتا کہ کیسے کیسے لشکروں نے اسے پار کیا، کس طرح فوجیں اس کے کنارے آپس میں ٹکرائیں اور کیسے اس کا پانی سُرخ ہوا۔تاریخ کو ایسے پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ تحریر کو جاذب اور پُراثر بنا دیتے ہیں۔اس کی مثال ایک گاؤں ہنڈ کے حوالے سے ملاحظہ ہو:

> پاکستان کا بہت چھوٹا سا گاؤں لیکن تاریخ کا بہت بڑا شہر!...... اس گاؤں کے دروازوں، قلعے کے کھنڈروں کی دیواروں، محمود کے سپاہیوں کی قبروں......کبھی آریاؤں کے قافلوں کے قدموں کی چاپ، کبھی اشوک کے جلوسِ شاہانہ کے باجے، کبھی سکندراعظم کے رتھوں کی گڑگڑاہٹ، کبھی حاکم غزنیں کی فوجوں کے نقارے اور طبل، کبھی چنگیز خان کے لشکر جرار کے نعرے اور کبھی بابر کی توپوں کو کھینچنے والے گھوڑوں کی ٹاپیں...... اس چھوٹے سے گاؤں ہنڈ کی چھاتی کو خداجانے کس کس نے روندا اور پامال کیا ہوگا۔(۱۴)

چھوٹے چھوٹے جملوں میں پوری تاریخ کو قید کرنے کا فن عابدی صاحب کے ہاں نظر آتا ہے۔شہروں کے بننے اور اُجڑنے کا عمل بھی ان کے سفرناموں میں ملتا ہے جیسے ٹھٹھہ کے علاقے کا ذکر کیا ہے جہاں پہلے عرب آئے، پھر سومرا خاندان آیا، سمہ خاندان آیا، جام نظام الدین جیسا حکمران آیا، پھر ارغون آئے، ترخان آئے اور اسے برصغیر کی کُلاہ میں ہیرے کی طرح جڑا۔اسی طرح موہنجوداڑو کی قدیم تہذیب کی جھلک دکھائی ہے۔اس کے کھنڈرات کی گلیوں میں سیر کرتے ہوئے آنگن، طاق، دریچوں، فصیلوں، اور ان سب کے درمیان پہاڑی کی طرح کھڑے ہوئے کُشانوں کے استوپا کو دیکھا اور ایسا منظر پیش کیا جیسے دیواریں سرگوشیاں کر رہی ہیں اور یہاں گزرے لمحوں کی کہانیاں سُنا رہی ہیں۔

اسی علاقے سے تھوڑا آگے اُس سیتا روڈ کا ذکر کیا جہاں سے اُترتے وہ جگہ تھی جہاں مغل شہنشاہ ہمایوں اور

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

حمیدہ بیگم کا نکاح ہوا۔اس لیے اُس روز مصنف کو وہاں سیج جیسے رنگ اور دلہنوں جیسی خوشبو محسوس ہوئی۔یہیں پر ہمایوں کا بیٹا اکبر پیدا ہوا۔ اور ہمایوں اسی راستے سے جان بچا کر بھاگا۔ایسی تاریخی معلومات کا بیان کہیں اور کم دیکھنے کو ملتا ہے۔علاقوں کی سیر کرتے ہوئے مصنف تاریخ کی سیاہی سے قلم ڈبو کر واقعات کو اپنے ذہن میں نقش کر کے جب سفرنامہ لکھنے بیٹھتے ہیں تو تحریر سفرنامے سے زیادہ تاریخ کا روپ دھار لیتی ہے۔اس سفرنامے میں چھوٹے بڑے تمام شہروں کی تاریخ کو بیان کیا ہے۔جیسے ایک علاقے بلوٹ کی تاریخ یوں دکھائی کہ اس کا پُرانا نام بل کوٹ تھا،حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سوا دو سال پہلے کا قلعہ اور بودھوں اور ہندوؤں کے آثار موجود تھے۔اسی علاقے کے ایک شخص مخدوم زادہ حاجی جعفر شاہ جو پنجاب یونی ورسٹی سے تاریخ کی تعلیم پا چکے تھے،مصنف کو بتاتے ہیں کہ یہاں پر رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی اور حضرت علیؓ کے گھوڑے کے سُم کا نشان ہے اور کم و بیش دس پندرہ مزاریں ایسی ہیں جو اصحاب سے منسوب ہیں۔ ان کی قدوقامت اور طوالت سے عربی نژاد لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ایسی معلومات کے بیان کے ساتھ وہ محکمۂ آثارِ قدیمہ کی غفلت پر مایوس اور افسردہ بھی نظر آتے ہیں کہ بہت سے علاقوں میں تاریخ خاک کے نیچے دبی ہوئی ہے اگر تحقیق کر کے اس کی کھدائی نہیں ہوئی تو یہ ورثہ ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائے گا۔

رضا علی عابدی کا سفرنامہ ''ریل کہانی'' ایک منفرد سفرنامہ ہے۔ ۱۹۹۷ء میں کتابی شکل میں سنگ میل پبلی کیشنز سے شائع ہوا۔ اس میں مصنف نے نہ صرف کوئٹہ سے کلکتہ تک ریل کے سفر کی روداد بیان کی بلکہ ریلوے کی پوری تاریخ قاری کے سامنے کھول کر رکھ دی۔مصنف نے اس کتاب کو بائیس ابواب میں تقسیم کر کے بلوچستان، سندھ، پنجاب، بھارتی پنجاب، یوپی تک کے شہروں کا ذکر کیا ہے۔ان میں کوئٹہ، مچھ،آبِ گم،رُک،سبی،جیکب آباد، روہڑی، ملتان، لاہور، اٹاری، امرتسر، روڑکی،لکھنو، بنارس، پٹنہ اور کلکتہ سمیت کئی چھوٹے بڑے علاقوں کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اپنے تاریخی شعور اور منفرد تخلیقی اظہار سے برصغیر میں ریلوے کے نظام کی مکمل تاریخ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس سفرنامے میں عابدی صاحب عام قاری کو یہ بتاتے ہیں کہ برصغیر میں ریل کا نظام لانا انگریزوں کے لیے ناگزیر تھا اس کی بہت سی وجوہات تھیں ایک طرف ملکی معیشت کو بہتر بنانے،آمدورفت میں سہولت پیدا کرنے اور خصوصاً اپنے ذاتی مفاد کی غرض سے ریل کے نظام کو یہاں لایا گیا اور اس منصوبے کو کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جیسے ایک طرف یہاں کے جغرافیائی حالات اتنے سازگار نہیں تھے، کہیں پہاڑی سلسلے تو کہیں تپتے صحرا درمیان میں حائل تھے۔دوسری طرف مقامی قبائلیوں کی طرف سے شدید مزاحمت کا سامنا تھا لیکن ان تمام مسائل سے نبرد آزما ہو کر انگریز افسروں،انجینئروں، ملازموں اور برصغیر کے محنت

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

کشوں اور مزدوروں نے اس بڑے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا اور کتنے ہی لوگوں نے اپنی جانیں قربان کیں۔ ایسی تمام تفصیلات اس سفرنامے میں موجود ہیں۔

اسی طرح ریلوے کے منصوبے پر کام کیسے شروع ہوا اس کے بارے میں مصنف بتاتے ہیں کہ ۱۸/ستمبر ۱۸۷۹ء کو وائسرائے کونسل نے قندھار ریلوے کی تعمیر کا فیصلہ کیا اور ۲۱/ستمبر کو تار پہنچا کے لائین ڈالی جائے۔ پھر ستمبر کے آخر میں انجینئروں کا عملہ آیا مزدوروں کی بھرتیاں شروع ہوئیں اوزار بننے لگے، محنت کشوں کی تربیت کی جانے لگی، دریاؤں پر بند باندھے گئےاور کام اتنی تیزی سے ہونے لگا جیسے کوئی فلم چل رہی ہو۔ ریلوے کی تاریخ کو اتنی سہل پسندی سے بیان کیا کہ قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسےاُن کی آنکھوں کے سامنے مزدور ہاتھوں میں اوزار لیے ریل کی لائنیں بچھا رہے ہیں، انگلستان سے آنے والے بحری جہاز برصغیر کی بندرگاہوں پر لنگر انداز ہو رہے ہیں اور اُن پر سے ریل کے انجن اُتارے جا رہے ہیں۔ یہ مصنف کا کمال ہی ہے کہ وہ اپنی تحریر کا اثر قاری پر قائم رکھتا ہے۔ سفرنامے میں دلچسپ تاریخی معلومات بھی دیں کہ دنیا کی سب سے پہلی ریل گاڑی ۱۸۲۵ء میں برطانیہ میں چلائی گئی پھر فرانس، امریکا، جرمنی، روس، اٹلی، اسپین، اور میکسیکو میں چلائی گئیں ہندوستان میں سب سے پہلے ریل گاڑی کہاں چلی اس کے بارے میں بھی معلومات فراہم کیں ہیں جیسے:

> ہندوستان میں سب سے پہلی ریل گاڑی سنہ ۱۸۵۳ء میں چلی۔ ۱۶/اپریل ۱۸۵۳ء کو بمبئی میں عام چھٹی کا اعلان کیا گیا۔ بوری بندر کے اسٹیشن پر گورنر کے بینڈ نے انگریزی دھنیں بجائیں اور جب سہ پہر تین بج کر ۳۵ منٹ پر پہلی گاڑی چار سو مسافروں کو لے کر چلی تو ہر رنگ، ہر نسل کے بے شمار لوگوں نے خوش ہو کر تالیاں بجائیں اور گاڑی کو اکیس توپوں کی سلامی دی گئی...... اس میں ۱۴ ڈبے لگائے گئے تھے اور تین انجن اسے کھینچ رہے تھے۔ ان انجنوں کے نام تھے: سندھ، سلطان اور صاحب۔ (۱۵)

ریل کہانی کا مطالعہ قاری انہماک سے کرتا ہے جیسے وہ خود اُس عہد میں موجود ہو۔ اسٹیشنوں کی عمارتوں کی تاریخ، قبائلیوں کے حملوں کا ذکر، اور ساتھ ہی مزدوروں کی بستیوں میں آنے والی مصیبتوں کا ذکر، ماضی میں ریلوے کے نظام میں پیش آنے والے حادثات، ان سب کا بیان باقاعدہ سنین کے ساتھ کیا ہے۔ دیگر سفرناموں کی طرح اپنے اس سفرنامے میں بھی رضا علی عابدی اس بات پر افسردہ دکھائی دیتے ہیں کہ مہذب معاشروں کے برعکس ہمارے ہاں تاریخی ورثے کو محفوظ کرنے کا کوئی خاص رجحان نظر نہیں آتا بلکہ تاریخ مٹانے کا کام بھر پور

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

انداز میں کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے رُک اسٹیشن کی صورتحال کچھ یوں بتائی کہ ٹکٹ گھر میں ایک بیضوی تختی کا نشان ملا جس پر اس اسٹیشن کی تاریخ سے متعلق معلومات درج ہوں گی تب علاقے کے ایک بوڑھے باشندے نے بتایا کہ یہاں ایک تختی تھی ایک بار کوئی افسر آئے اور نکال کر لے گئے۔ ''ریل کہانی'' میں انھوں نے ریلوے کی تاریخ کو مفصّل انداز میں بیان کیا اور ایسے حقائق سامنے لائے جو قاری کی دسترس سے باہر تھے۔ عبدالباسط ذوالفقار اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''رضا علی عابدی نے 'ریل کہانی' کی چھوٹی سی کتاب میں ریل کا پورا عہد قید کر دیا ہے۔''(۱۶) رضا علی عابدی کے سفرناموں میں تاریخ کی کثرت دیکھ کر ان کے تاریخی شعور کی پختگی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سچائی کو پا لینا ہی ادیب کا کام نہیں بلکہ اصل کام تخلیقی اور فن کارانہ انداز میں اپنے قاری تک اسے پہنچانا ہے۔ جیسے ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں کہ ''ادبی مورخ کا یہ کڑا امتحان ہوتا ہے کہ وہ کسی دور کو سمجھنے اور سمجھانے میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔''(۱۷) رضا علی عابدی ادبی مؤرّخ کی طرح اپنے سفرناموں میں مختلف ادوار، عصری صورتِ حال اور تاریخ کی کڑیوں کو نہ صرف خود اچھی طرح سمجھتے ہیں بلکہ اپنے قارئین کو سمجھانے میں بھی کامیاب ہوتے ہیں۔ اُردو ادب کے دیگر سفرناموں کے برعکس رضا علی عابدی کے سفرناموں میں تاریخ کا بیان زیادہ نظر آتا ہے۔ اِن کے ہاں سفر کا احوال، منظر کشی، جغرافیائی حالات، تہذیب و ثقافت کے رنگ اور ساتھ میں تاریخ کے بیان سے سفرنامے دلچسپ اور معلوماتی بن جاتے ہیں۔ جہاں قاری سفر کے حالات سے لطف اُٹھاتا ہے وہیں تاریخی معلومات سے اپنے علم میں اضافہ بھی کرتا ہے۔ تاریخ کے بیان میں بھی یہ اعتدال پسندی سے کام لیتے ہیں تا کہ سفرنامے کا ادبی حُسن برقرار رہ سکے۔ ان کا تاریخی شعور ان کے سفرناموں کو جدت اور ادبی وقار عطا کرتا ہے۔

حواشی

۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اردو ادب میں سفرنامہ''، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۵۴
۲۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۱۱
۳۔ رضا علی عابدی، ''ریڈیو کے دن''، ایضاً، ۲۰۱۲ء، ص ۹۴
۴۔ مولوی ذکاءاللہ، ''تاریخ ہندوستان سلطنت اسلامیہ کا بیان''، علی گڑھ: مطبع انسٹی ٹیوٹ، جلد سوم، ۱۹۱۶ء، ص ۲۷۲
۵۔ صفدر حیات صفدر، ''عہدِ مغلیہ مع دستاویزات''، لاہور: نیو بک پیلس، سن ندارد، ص ۹۸
۶۔ رضا علی عابدی، ''جرنیلی سڑک''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص ۳۵
۷۔ ایضاً، ص ۱۶۸

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

۸۔ ایضاً،ص ۲۱۲ تا ۲۱۳

۹۔ ایضاً،ص ۵۶

۱۰۔ رضا علی عابدی،''ریڈیو کے دن''،لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء،ص ۱۹۰

۱۱۔ نورین تبسم،''رضا علی عابدی کی کتابیں''، http://noureennoor.blogspot.com/2014/08/Raza-Ali-Abidi-Books.htm، استفادہ، مؤرّخہ: ۳۰رمئی ۲۰۱۹ء، (بوقت رات ساڑھے آٹھ بجے)

۱۲۔ رضا علی عابدی،''جہازی بھائی''،لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۱۵ء،ص ۲۸

۱۳۔ سبطِ حسن،''پاکستان میں تہذیب کا ارتقا''، کراچی: مقصود پریس، ۲۰۱۷ء،ص ۴۹

۱۴۔ رضا علی عابدی،''شیر دریا''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء،ص ۱۲۳

۱۵۔ رضا علی عابدی،''ریل کہانی''، ایضاً، ۲۰۱۴ء،ص ۱۵۳

۱۶۔ عبدالباسط ذوالفقار،''ایک کہانی کی کہانی''استفادہ،مؤرّخہ: ۱۴رجون ۲۰۱۹ء، https://www.jasarat.com/blog/2019/01/04/a-basit-zulfiqar-19/

۱۷۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر،''اردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک''، محولۂ بالا،ص ۱۱

مآخذ

۱۔ حسن، سبطِ،''پاکستان میں تہذیب کا ارتقا''، کراچی: مقصود پریس، ۲۰۱۷ء

۲۔ ذکاء اللہ، مولوی،''تاریخ ہندوستان سلطنت اسلامیہ کا بیان''، علی گڑھ: مطبع انسٹی ٹیوٹ، جلد سوم، ۱۹۱۶ء

۳۔ سدید، انور، ڈاکٹر،''اردو ادب میں سفرنامہ''، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء

۴۔ صفدر، صفدر حیات،''عہدِ مغلیہ مع دستاویزات''، لاہور: نیو بک پیلس، سنہ ندارد

۵۔ عابدی، رضا علی،''ریڈیو کے دن''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

۶۔ ________،''جرنیلی سڑک''، ________، ۲۰۱۷ء

۸۔ ________،''جہازی بھائی''، ________، ۲۰۱۵ء

۹۔ ________،''شیر دریا''، ________، ۲۰۱۸ء

۱۰۔ ________،''ریل کہانی''، ________، ۲۰۱۴ء

۱۱۔ کاشمیری، تبسم، ڈاکٹر،''اردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک''، ________، ۲۰۰۹ء

ویب سائٹس

1. http://noureennoor.blogspot.com/2014/08/Raza-Ali-Abidi-Books.htm
2. https://www.jasarat.com/blog/2019/01/04/a-basit-zulfiqar-19/